TAHREER Journal of Languages & Literature
eISSN:3007-2085
pISSN:3007-2077
تحریر
Vol. 4 No. 3 (2026) HEC-approved in the **Y** category

A Critical Study of Trends of Enlightenment in Urdu Short Stories

اردو افسانے میں روشن خیالی کے رجحانات کا تنقیدی مطالعہ

Nazish Ishaque[1*], Dr Syed Aoun Sajid[2]
[1]PhD Urdu Scholar, [2]Assistant Professor, Urdu, Federal Urdu University, Islamabad
***Corresponding Email:** nazishabbasi786@gmail.com
DOI: https://doi.org/10.65827/tahreer.v4i3.88

Abstract

Enlightenment refers to an intellectual movement that values reason, knowledge, liberty, and critical awareness. During the seventeenth and eighteenth centuries, Enlightenment thought significantly shaped Europe's intellectual and social transformation. In the Indian subcontinent, similar ideas gained influence through modern education, rational inquiry, and the reformist work of Sir Syed Ahmad Khan. Urdu fiction reflected these principles through realism, social reform, advocacy of human equality, resistance to injustice, and criticism of rigid customs and traditions. The publication of Angarey and the rise of the Progressive Writers' Movement further promoted these ideas. Writers such as Saadat Hasan Manto, Krishan Chander, Rajinder Singh Bedi, Ismat Chughtai, and Ahmad Nadeem Qasmi presented them through diverse literary works. Historical developments such as Partition, the establishment of Pakistan, political instability, state oppression, and the separation of East Pakistan broadened the intellectual concerns of Pakistani fiction. The concept of "Enlightened Moderation," introduced during the Musharraf era, marked another significant phase in this intellectual trajectory. In this way, Urdu short stories encourage rational thought, social awareness, and critical consciousness through their examination of social and cultural structures.

Keywords:
Enlightenment, Rationalism, Critical Consciousness, Urdu Fiction, Progressive Writers' Movement, Angarey, Realism, Social Reform, Pakistani Fiction

Received: 31-05-2026 **Accepted:** 05-07-2026 **Online:** 30-09-2026

This article is licensed under the Creative Commons Attribution (CC BY 4.0). Free use, distribution, and reproduction are permitted with proper citation of the original work.
© The Author(s).

کرہ ارض پر موجود دیگر جانداروں کی طرح انسان بھی ایک حیاتیاتی وجود ہے اور اس کی شناخت اس کے جسم، جبلت یا بقا تک محدود نہیں بلکہ وہ ایسی مخلوق ہے جو زندہ رہتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے اور فطرت کا حصہ ہوتے ہوئے فطرت پر غور کرتا ہے۔۔ ابتدائی تہذیبوں میں انسان اپنے تجربات کو اساطیر، مذہب اور رسومات کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جہاں فکر انسانی نے اخلاقیات کو جنم دیتے ہوئے اچھے اور برے میں تمیز پیدا کی۔ بعد ازاں فلسفے کا ظہور ہوا جس میں روایت کے بجائے عقل اور دلیل کو اہمیت دی گئی۔ یونانی مفکرین خصوصاً سقراط اور ارسطو نے انسان کو عاقل حیوان قرار دے کر واضح کیا کہ انسان کی اصل پہچان اس کی عقل ہے یہاں انسانی فکر پہلی بار شعوری اور منظم انداز میں سامنے آئی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے دور میں مذہب کا غلبہ رہا مگر انسانی فکر مکمل جمود کا شکار نہیں ہوئی۔ عقل کو ایمان کے ساتھ جوڑ کر انسانی زندگی کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ علم محفوظ ہوتا گیا اور فکری روایت زندہ رہی۔ دورِ جدید میں سائنس اور تجربے نے انسانی فکر کو ایک نئی سمت دی جہاں روشن خیالی نے انسان کو یہ شعور دیا کہ وہ اپنی عقل کو آزادانہ تنقیدی، اصلاحی اور شعوری انداز میں استعمال کرے۔

روشن خیالی (enlightenment) دراصل سترھویں اور اٹھارویں صدی کا ایک ایسا فکری انقلاب تھا جس نے یورپ کو ترقی کی نئی راہوں پہ گامزن کیا۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جو معاشرے، سائنس اور سیاست پر ہر زاویہ سے اثر پذیر ہوئی۔ اس تحریک کا بنیادی نظریہ و فلسفہ عقلیت، جواز اور حقائق پر مبنی معلومات کے گرد گھومتا ہے۔ یہ توہمات اور خوف کی جگہ دلائل کی بات کرتے ہوئے انسانی معاشرے کو ایک بہتر جگہ بنانے پر زور دیتا ہے۔ روشن خیال مفکرین کا ماننا تھا کہ انسان روایتی عقائد اور مذہبی اقتدار سے راہ فرار اختیار کر کے عقل کی روشنی میں اپنی زندگی کو بہترین بنا سکتا ہے۔ روشن خیالی (enlightenment) کی جڑیں یورپ کی نشاۃ ثانیہ (renaissance) میں ملتی ہیں۔ نشاۃ ثانیہ (renaissance) کے دوران کلاسکی، یونانی اور رومی تہذیبوں کے علوم کا از سر نو احیاء ہوا اور انسانوں نے فطرت، فنون اور علوم میں جدید تحقیقات شروع کیں۔ اس عہد میں انسانوں نے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا شروع کیا اور روایتی و مذہبی عقائد پر سوالات اٹھائے۔ نشاۃ ثانیہ (renaissance) نے انسانوں میں سوال، تجسس، تخلیقی صلاحیت اور تجزیاتی سوچ کو اجاگر کیا جو روشن خیالی (enlightenment) کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اگرچہ روشن خیالی (enlightenment) کو براہ راست نشاۃ ثانیہ (renaissance) کا تسلسل نہیں کہا جا سکتا مگر یہ بات واضح ہے کہ نشاۃ ثانیہ (enlightenment) نے روشن خیالی (enlightenment) کے لیے ذہنی اور ثقافتی ماحول فراہم کیا۔

اردو کی علمی ادبی دنیا میں روشن خیالی (enlightenment) ایک ایسی فلسفیانہ اصطلاح ہے جسے رائج ہوئے کئی عشرے گزر چکے ہیں۔ علی عباس جلال پوری "خرد نامہ جلال پوری" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"مغربی ممالک میں اٹھارویں صدی میں (enlightenment) کی تحریک برپا ہوئی تھی۔ راقم السطور نے اس

کا ترجمہ تحریک خرد افروزی سے کیا۔ خرد افروزی کی یہ تحریک ہالینڈ اور فرانس سے شروع ہوئی اور تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی۔"[1]

قومی انگریزی اردو لغت میں روشن خیالی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"روشن خیالی، آگاہی، روشنی، طبع یورپ میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کی ایسی ثقافتی اور فلسفیانہ تحریک تھی جس میں تسلیم شدہ عقائد پر گرفت کی گئی، عقل کے آزادانہ استعمال پر زور دیا گیا، سائنسی تجربیت کو فروغ دیتے ہوئے انسانی وقار اور فلاح و بہبود کو سب سے اہم قرار دیا گیا۔"[2]

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی عباس جلال پوری جسے خرد افروزی کہتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی اسی کو روشن خیالی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ معنوی اعتبار سے روشن خیالی، خرد افروزی، عقلیت پسندی، آزاد خیالی اور ترقی پسندی مماثل اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں حد فاصل قائم کی جا سکتی ہے۔

روشن خیالی (enlightenment) ایک ہمہ گیر فکری تحریک ہے۔ مغرب میں اس تحریک کا آغاز سترھویں صدی کے اوائل میں ہوا اور تقریباً ۱۶۲۰ سے ۱۷۸۰ تک مختلف فکری، سماجی اور سیاسی صورتوں میں جاری رہی۔ اس دور میں یورپ بالخصوص فرانس فکری اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ روشن خیالی کے اس تاریخی عمل کو عموماً تاریکی سے روشنی، جبر سے آزادی، ظلم سے انصاف، بادشاہت سے جمہوریت اور جہالت سے علم کی طرف انسانی شعور کی دریافت بھی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کی قیادت دیکارت، کانٹ، منتسکیو، ڈیوڈ ہوم اور ڈینس دیدرو جیسے مفکرین نے کی۔ یہ تحریک دراصل یورپی نشاۃ ثانیہ کی فکری توسیع تھی جسے (Age of enlightenment) یا (Age of reason) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

روشن خیالی کی بدولت خدا، عقلِ استدلالی، فطرت اور انسان کے باہمی تعلقات کو نئے زاویہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دانشوروں کی سرپرستی میں اس تحریک کے ذریعے زندگی کے مروجہ مسلمہ اور غیر تنقیدی تصورات کو عقلی جانچ پڑتال کے عمل سے گزارا گیا۔ بادشاہوں کے الٰہی حق، طرز حکومت، چرچ اور ریاست کے باہمی تعلق، فرد کی آزادی اور غیر مساوی سماجی طبقات جیسے بنیادی مسائل پر سنجیدہ سوالات اٹھائے گئے جس کے نتیجے میں اصلاح، تبدیلی اور فکری بیداری کی نئی راہیں ہموار ہونے کا دعویٰ کیا گیا۔

ادب تخلیقی اظہار ہے اور اس کا جوہر محض جذبات، تخیل یا داستان گوئی تک محدود نہیں بلکہ یہ ایسا فکری عمل ہے جو اپنے عہد کی تہذیبی، معاشی و معاشرتی، سیاسی، اور نفسیاتی اکائیوں کو پیش کرتا ہے۔ افسانہ اردو ادب کی ایک مشہور صنف ہے۔ افسانہ فارسی سے ماخوذ لفظ ہے جس کے معنی گھڑے ہوئے قصے کے ہیں۔ ایک ایسی کہانی جو خیالات و واقعات پر مبنی ہو۔ "فرہنگ آصفیہ" میں افسانہ کے معنی اس

طرح بیان ہوئے ہیں:

''حکایت بے اصل، قصہ، من گھڑت کہانی، گھڑا ہوا قصہ یا جھوٹی بات۔''[3]

ناول کی طرح افسانہ بھی انگریزی ادب کے ساتھ ہی ہندوستان میں آیا۔ برصغیر میں کہانی لکھنے، کہنے اور سننے کی روایت زمانہ قدیم سے موجود تھی اور مختلف ادوار میں یہ روایت ارتقاء پذیر رہی۔ زمانے کی تیز رفتاری کے باعث داستان اور ناول قاری کا ساتھ نہ دے پائے تو ایسے میں ایک منفرد نثر وجود میں آئی جسے مختصر افسانہ کہا گیا اردو میں مختصر افسانہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وجود میں آیا۔ پروفیسر وقار عظیم اپنی تصنیف ''داستان سے افسانے تک'' میں یوں لکھتے ہیں:

> ''کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک تاثر، ایک اصطلاحی مقصد، یا ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی کے انداز میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے ممتاز اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو۔ افسانے کی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا۔''[4]

افسانے کی اسی انفرادیت نے قارین کے دل ودماغ پر اثر ڈالا اور یہ صنف براہ راست اور مختصر اور جامع انداز میں زندگی کی سچائیوں اور تجربات کو بیان کرنے میں موزوں ثابت ہوئی۔

۱۸۵۷ کی شکست کے بعد مسلم معاشرہ شدید تنزلی کا شکار ہوا۔ ایسے میں سرسید احمد خان اور ان کے رفیقوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول اور سائنس وعقل کی روشنی میں اپنی فکر ڈھالنے کی طرف راغب کیا۔ جس کا مقصد تھا کہ مسلم معاشرہ توہم پرستی اور جمود کی کیفیت سے نکل کر نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی شناخت بنائے۔ اسی عہد میں ہندوستانی سماج میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایسے میں انگریزی تعلیم، سائنسی ترقی، مطبع کے فروغ اور نوآبادیاتی چیلنجوں نے برصغیر میں روشن خیالی کو بنیادیں فراہم کیں۔ صنعتی وتجارتی تبدیلیوں جیسے ریل، ٹیلی گراف اور ڈاک کے پھیلاؤ نے معاشی سرگرمیوں کو تیز کر دیا جس سے نئے متوسط طبقے نے جنم لیا۔ برطانوی پالیسیوں سے تنگ اور جاگیرداروں کی ظالمانہ گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسان اور مزدور تحریکیں بھی ساتھ ساتھ پروان چڑھنے لگیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی رسائل واخبارات نے عوام میں سیاسی وسماجی بیداری پیدا کی اور مغربی فلسفہ، لبرلزم، قوم پرستی اور سوشلسٹ خیالات تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچے۔ ان عوامل کی بدولت تنقیدی سوچ کو فروغ ملا۔ مذہبی وسماجی رسومات پر سوالات اٹھنے لگے اور ادب وصحافت میں حقیقت نگاری اور اصلاحی رجحان پروان چڑھنے لگا۔ ایسے میں افسانہ نگار بھی اس وسیع تر قومی مفاد سے وابستہ رہے۔ ابتدائی طور پر اردو افسانہ نگاری میں دو رجحانات رومانویت اور حقیقت نگاری واضح نظر آتے ہیں تاہم اردو کے ابتدائی افسانہ نگار جیسے راشد الخیری، حکیم یوسف حسن، سلطان حیدر جوش، پریم چند اور مہاشہ سدرشن کے ہاں قوم پرستی، اصلاح نسواں، ہندو مسلم سوسائٹی کے فرسودہ رسوم و رواج اور جاگیرداروں کے خلاف مزاحمت کا رجحان واضح ہے جو روشن خیالی کا ایک پہلو ہے۔ راشد الخیری جنہیں پہلا اردو افسانہ نگار مانا جاتا ہے

ان کے بیشتر افسانے مسلم سوشل موضوعات پر ہیں۔آپ نے والدہ کی صحبت کے باعث تمام عمر مسلمان عورت کی مظلومیت اور مشکلات کو اپنے افسانوں میں بیان کیا، جس کی وجہ انہیں مصورِ غم کا لقب دیا گیا ۔آپ کی کہانیوں میں عورت پیدائش سے لے کر زندگی کی آخری سانسوں تک ظلم و ستم اور ناانصافی کا شکار رہتی ہے۔''طلاقن کا سفید بال'' میں یوں لکھتے ہیں:

''طلاق اور خلع دونوں برابر کے حق تھے طلاق مردوں کا حق تھا خلع عورت کا۔آج کا مسلمان، عورت کا حق غصب کر چکے ہیں اور تمام ہندوستان میں خلع کا نام تک نہیں[۵]۔''

افسانہ ''نند کا شکار'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''مہر معاف کر دے گی تو طلاق دے دوں گا، نماز کا وقت ہو گیا ہے اب میں جاتا ہوں، اظہر یہ کہہ کر باغ سے باہر آیا اس کا سر منڈا ہوا تھا ٹخنوں سے اونچا پاجامہ تھا اور وظیفوں کی کثرت نے اس کا دل سخت کر دیا تھا مسجد میں نماز پڑھی، باچھیں چیر کر گڑ گڑا تا رہا اور تسبیح پھیرتا ہوا گھر چلا گیا۔''[۶]

راشد الخیری کے یہ افسانے محض تخیل کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ زوال پذیر معاشرے کی ریاکار قدروں کو سامنے لاتے ہیں۔وہ بچیوں اور خواتین کے حقوق کی بات کرتے ہیں اور اسلام کے اصولوں کی تشریح کسی خود فرض اور ریاکار کو دینے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ اسلام ملا کہ ہاتھوں جاہلانہ سوم ورواج کا محافظ، جامد قواعد کا مجموعہ اور جبر واستحصال کا ذریعہ بنتا چلا جا رہا ہے۔آپ انتہائی ترش لہجے میں مولویوں اور ان کے عقائد پر تنقید کرتے ہیں اور اسلام کو انسان دوست، فطرت سے ہم آہنگ اور عقلی مذہب کے طور پر سامنے لاتے ہیں جو انسانی فطرت، عقل اور اخلاقی توازن کو مرکزیت دیتا ہے۔ حقیقی مذہبی شعور انسان کی آزادی، عزت اور اخلاقی ذمہ داری کو مقدم رکھتا ہے اور یہی روشن خیالی ہے۔

روشن خیالی اور اصلاح پسندی میں پریم چند اور مہاشہ سدرشن ہندوانہ نقطۂ نظر کے نمائندہ ہیں۔پریم چند کو برصغیر کے پہلے حقیقت پسند افسانہ نگار کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔آپ کے افسانے انسانی زندگی کی محرومی، غربت، استحصال، طبقاتی ناانصافی اور سماجی برائیوں کا پرتوں ہیں۔آپ نے دیہاتی زندگی، کسانوں کی غربت، جاگیردارانہ جبر واستحصال، عورتوں کی مظلومیت اور مزدور طبقے کے دکھوں کو اپنا موضوع بنایا۔پریم چند کے افسانوں نے معاشرے میں جو کردار ادا کیا اس کی مثال ان کے افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن'' کے ردعمل میں محققین کو صاف نظر آتی ہے کیونکہ سوزِ وطن کو اشتعال انگیز قرار دے کر اس کتاب کی بکی ہوئی ۳۰۰ کاپیاں چھوڑ کر باقی ۷۰۰ کاپیاں ضبط کر کے نذرِ آتش کر دی گئیں۔

پریم چند کے چوتھے افسانوی مجموعے ''خاک پر دانہ'' کے افسانوں ''تالیف، ستیا گر اور دعوت'' سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ مذاہب کے سلسلے میں پریم چند کے ہاں کیسے روشن خیالی پیدا ہوئی اور وہ اس بات پر زور دیتے دکھائی دیے کہ مذہب محض رسومات کا مجموعہ

TAHREER
Journal of Languages & Literature
eISSN:3007-2085
pISSN:3007-2077
تحریر

نہیں ہے بلکہ سماجی خدمات کا اعلیٰ انسانی ادارہ ہے۔ ''سوا سیر گیہوں'' میں مہاجن کو اس آکاس بیل کی صورت دکھایا گیا ہے جو کسان کے شجرِ حیات کو چاٹ کر خود پھیلتی پھولتی ہے۔ افسانے میں مظلوموں لوگوں کے اس رویے کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ کیسے عقائد کے نام پر ظلم ستم اور ناانصافی برداشت کرتے رہتے ہیں۔

> ''شنکر سال بھر تک تپسیا کرنے پر بھی جب قرض بے باق کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کی احتیاط مایوسی میں بدل گئی۔۔۔ جب سر پر قرض کا بوجھ ہی لدنا ہے تو کیا من بھر اور کیا سوا من کا۔ اس کی ہمت پست ہو گئی۔ محنت سے نفرت ہو گئی۔''[7]

یہ محض ایک فرد کی معاشی ناکامی کی کہانی نہیں بلکہ سماجی و معاشرتی جبر پر ایک گہرا فکری تبصرہ ہے۔ محنت سے نفرت پیدا ہونا انسانی فطرت کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ استحصالی معاشی ڈھانچے کا رد عمل ہے۔ روشن خیال فکر کے مطابق ایسا معاشی نظام جو محنت کو بے اجر اور قرض کو دائمی بنا دے وہ انسان کی خودی، عزت و وقار اور شعور کو مجروح کرتا ہے۔ اقتباس میں فرد کی ہمت اور امید کا ٹوٹ جانا علامت ہے کہ کیسے انسان باعزت زندگی کے بجائے صرف بقاء کی جنگ لڑنے پر مجبور ہے۔ افسانہ اس اعتبار سے روشن خیالی کے اس بنیادی موقف کو تقویت دیتا ہے کہ غربت، قرض اور معاشی ناانصافی اخلاقی مسئلہ نہیں بلکہ فکری اور سماجی مسئلہ ہے۔ جب تک متوازن معاشی متوازن نظام، انصاف اور انسانی وقار کو بحال نہیں کیا جاتا فرد کی محنت اور دیانتداری بھی اسے مایوسی سے بچا نہیں سکتی۔

پہلا روشن خیال اردو مجلہ ''انگارے'' دسمبر ۱۹۳۲ میں وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوا۔ انگارے سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی مشترکہ تخلیقی کوشش تھی جس میں نو افسانے اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔ انگارے کے تمام مصنفین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انگارے میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے ''نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، گرمیوں کی ایک رات، دلاری اور پھر یہ ہنگامہ''، احمد علی کے دو افسانے ''بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات''، محمود الظفر کا افسانہ ''جواں مردی''، رشید جہاں کا افسانہ ''دلی کی سیر'' اور مختصر ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' شامل تھا۔ اس مجموعے کے مصنفین نے اپنے افسانوں کا موضوع معاصر معاشرے کی گھناؤنی ذہنیت کو بنایا تھا۔ پروفیسر قمر رئیس اپنے مضمون ''اردو افسانے میں انگارے کی روایت'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''واقعہ یہ ہے کہ انگارے کی کہانیوں میں وہ تمام اہم رجحانات پوشیدہ تھے جو بعد میں ہمارے نئے افسانے میں زیادہ مہارت فن اور امتیازی محسن کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ مثال کے طور پر جنسی نفسیات اور تجربات کا بے لاگ حقیقت پسندانہ بیان جس نے بعد میں منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد، حسن عسکری اور دوسرے افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں ایک میلان کی صورت اختیار کر لی، اس کے ابتدائی نقوش اسی مجموعے میں ملتے ہیں۔''[8]

افسانہ ''جنت کی بشارت'' میں مذہبی عقائد پر بلاواسطہ طنز کے بجائے مولانا داؤد کے کردار ذریعے مذہبی ریاکاری اور فریب کو

اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے میں براہ راست مذہبی قدامت پسندی کی نفی یا طنز نہیں ملتا بلکہ ایک آئینے کی طرح اس نظام کے تضادات، ہوس اور فریب خوردگی کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ افسانہ ''جنت کی بشارت'' سے ایک اقتباس دیکھیے:

''ان کے لمبے کرتے اور قبائیں، ان کی کفش اور سلیپر ان کی دو پلی ٹوپیاں، اُن کا گھٹا ہوا گول سر اور ان کی متبرک داڑھیاں جن کے ایک ایک بال کو حوریں اپنی آنکھوں سے ملیں گی، ان سب سے ان کا تقدس اور زہد ٹپکتا ہے۔''[9]

اس افسانہ میں عقلی تنقید مذہبی تشخص پر مرکوز ہے جس میں مذہب کے نام پر چلنے والی رسمیت اور اس کے تضادات کو سامنے لایا گیا ہے۔ روشن خیالی کا مقصد مذہب کو رد کرنا نہیں ہے ان انسانی اور معاشرتی اغراض و مقاصد کی جانچ پڑتال کرنا ہے جو مذہب کے اندر موجود ہیں اور یہی اس افسانے کا بیانیہ ہے۔ افسانے میں مولانا داؤد کا کردار ایک پیچیدہ انسانی شخصیت کے طور پر پیش ہوا ہے۔ یہ افسانہ مذہبی قدامت پسندی اور اخلاقی ریاکاری کے خلاف روشن خیال طرز فکر کا مضبوط ادبی اظہار ہے جو مذہبی اداروں کے سماجی کردار پر سوال اٹھاتا ہے۔ انگارے ایسا بیانیہ منشور تھا جس نے مذہب، کلچر اور سماجی روایات پر سوالات اٹھائے۔ روشن خیالی کو عموماً عقلی تنقید، مذہبی اور روایتی اساطیر پر شکوک، شخصی آزادی، انسانی حقوق اور معاشرتی اصلاح کے مطالبات کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور انگارے میں یہی اصول کھل کر سامنے آئے۔ ''انگارے'' نے اردو افسانے میں ایک نئے انقلاب کی نوید سنائی جسے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ زمانے کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار کو اپنے فکر و فن میں سمو کر ایک نئی روایت قائم کی۔ ترقی پسند تحریک نے روشن خیالی کو مغربی فلسفہ کے بجائے برصغیر کی تاریخی، تہذیبی اور عصری صورتحال سے ہم آہنگ کر کے مقامی فکری بیداری میں بدل دیا۔ ترقی پسند تحریک کو روشن خیالی سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی فکری بنیادیں یورپ کی روشن خیالی کی متعین کردہ ہی ہیں۔ یعنی انسانی عقل پر اعتماد مذہبی تقدس کے بجائے انسان دوستی کا بیانیہ، علم کے خلاف تمام اداروں کی مزاحمت چاہے وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، آزادی اظہار اور عوامی شعور کی بیداری وغیرہ۔ ترقی پسند اردو افسانہ میں طبقاتی جبر، مذہبی تنگ نظری، عورت کی محکومی، سماجی منافقت اور نوآبادیاتی استعمار کے خلاف زبردست احتجاج ملتا ہے۔ یہ احتجاج اسی فکری روشنی کا نمائندہ ہے جس نے انسان کو آزادانہ سوچنے، سوال اٹھانے اور روایات سے انکار کرنے کا حوصلہ دیا جس کا آغاز یورپ میں روشن خیالی کی تحریک سے ہوا۔

''سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور احمد ندیم قاسمی'' نے اپنے افسانوں میں روشن خیالی کے مظاہر کو جیتی جاگتی کہانیوں میں مجسم کر کے دکھایا۔ ان کے افسانوں میں عقل و شعور کی بالادستی، انسان دوستی، آزادی اظہار، سماجی انصاف، عورت کی شناخت اور استحصال کے خلاف احتجاج واضح ہے جو روشن خیالی کا ہی بیانیہ ہے۔

''موذیل'' اردو افسانہ میں روشن خیالی کی عمدہ مثال ہے۔ منٹو نے اس افسانہ میں انسان، مذہب، عورت، اخلاق اور معاشرتی اقدار کے بارے میں ایسے سوالات اٹھائے ہیں جو کئی صدیوں سے روایات اور رسم و رواج کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔ بنیادی طور پر افسانہ

تقسیم ہند کے فسادات کے پس منظر میں ہے جہاں مذہب اور قومیت کے نام پر انسانیت کا قتل عام ہے۔ منٹو ایک یہودی لڑکی موذیل کے کردار کے ذریعے دکھاتے ہیں کہ انسانیت کی اصل قدر قوم یا مذہب کے بجائے انسان کے اپنے ضمیر یا احساس سے طے ہوتی ہے۔ موذیل ایک غیر معمولی افسانوی کردار ہے وہ معاشرتی بندشوں سے مکمل آزاد ہے۔ کھل کر ہنستی ہے، بولتی ہے، وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کی عادی ہے اور بالآخر اپنی جان ایک ایسے عمل میں قربان کرتی ہے جو کسی مذہب یا نظریے کے بجائے انسانیت کا مظہر ہے۔ وہ روایتی عورتوں کی طرح شرم وحیا کے تعاقب میں چھپنے کے بجائے پر اعتماد ہے اور اپنی آزادی پر فخر محسوس کرتی ہے۔ منٹو نے موذیل کے کردار کو برصغیر کے معاشرے کی دوغلی اخلاقیات کے سامنے لا کھڑا کیا ہے جو عورت کی جسمانی اور ذہنی آزادی سے خوفزدہ ہے۔ افسانے کا مرکزی خیال یہی ہے کہ جب مذہب، قوم یا عقیدہ انسانوں کے اندر ہمدردی اور رحم کو ختم کر دے تو اس وقت اخلاقی معیار عقل اور ضمیر سے طے ہوتے ہیں۔ فسادات کے دوران جب ہر طرف نفرت اور تشدد پھیل گیا تو موذیل نے ایک سکھ لڑکی کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔ موذیل نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ مرنے والی اس کے مذہب کی ہے یا نہیں۔ وہ صرف انسانیت کے ناطے اس کی جان بچانے چلی گئی یہی لمحہ منٹو کی انسان دوستی کا نقطہ عروج ہے کہ جب مذہب، قوم اور نسل بے معنی ہو جاتے ہیں تو صرف انسان بچتا ہے۔ کہانی میں جگہ جگہ ترلوچن کے کردار کے ذریعے مذہب کی ظاہری علامات پر طنز ہے اور موذیل کا کردار سراپا انسانیت بن کر سامنے آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

> ''موذیل تمام تر سماجی قدروں کی باغی ہے اسے مذہب اور اخلاقی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس میں انسان دوستی کی ایسی شمع روشن ہے جو انسان کو انسان سے ملاتی ہے، اس وقت بھی جب وہ انسان کی جان بچانے کے لئے اپنی جان دے رہی ہے۔''[10]

روشن خیالی یہی ہے کہ کسی قسم کے مذہبی خوف یا ثواب کے لالچ کے بجائے اخلاق کا سرچشمہ انسان کا ضمیر ہونا چاہیئے۔ ترلوچن کا کردار اس معاشرتی تضاد کو ظاہر کرتا ہے جو مذہبی جذبات اور اخلاق کی سچائی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ منٹو نے موذیل کے کردار میں انسان کی اخلاقی پیچیدگیوں کو بھی نمایاں کیا ہے کہ نہ وہ مکمل نیکی کی علامت ہے نہ محض گناہ کی۔ مگر اس کا انجام سب کو شرمندہ کر دیتا ہے کہ وہ کسی مذہبی یا اخلاقی بھنور میں قید نہیں بلکہ اپنی عقل واحساس کے امتزاج سے عمل کرتی ہے۔ موذیل کی موت جسمانی انجام کے بجائے ایک اخلاقی فتح ہے وہ ان سب کے مقابل جیتی ہے جنہوں نے قومیت یا مذہب کے نام پر انسانیت کو پامال کیا اصل ایمان وہی ہے جو انسان کے دل میں جاگنے والی روشنی سے جنم لے اور یہی روشنی منٹو کی روشن خیالی ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ ''لحاف'' بظاہر ہم جنس پرستی کے موضوع پر ہے لیکن اس کی اصل اہمیت روشن خیالی کے عناصر میں پوشیدہ ہے۔ ''لحاف'' کسی نوعمر لڑکی، لڑکے کی کہانی نہیں بلکہ ۴۰ سالہ عورت بیگم جان کی کہانی ہے۔ بیگم جان کے غریب ماں باپ ان کی شادی نواب صاحب سے کر دیتے ہیں کہ نواب صاحب شریف اور نیک ہیں، حج بھی کیا ہوا ہے اور یہاں تک کہ وہ بازاری عورتوں اور

طوائفوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بیگم جان سے ان کی شادی ہوتی ہے لیکن وہ گھر میں رکھے ہوئے سامان کی طرح بیگم جان کو بھول جاتے ہیں۔ افسانے کا اقتباس اس طرح سے ہے:

> ''بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انہیں کل ساز و سامان کی طرح گھر میں رکھ کر بھول گئے اور وہ بچاری دبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے درد میں گھلنے لگی۔''[11]

نواب صاحب دراصل کم عمر خوبصورت لڑکوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ انہیں بیگم جان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بیگم جان کی زندگی بظاہر بڑی پر سکون اور پر تعیش نظر آتی ہے لیکن نواب صاحب کی زندگی میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

بیگم جان ہی اس کہانی کی روح رواں ہیں اور ساری کہانی انہی کے گرد گھومتی ہے۔ مصنفہ نے بہت گہرائی سے بیگم جان کے کردار کے ذریعے عورت کے جذبات اور اس کی باطنی تنہائی کو حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بظاہر تو بیگم جان کی زندگی پر تعیش ہے مگر اندر سے وہ جذباتی محرومی کا شکار ہیں۔ یہ افسانہ ان سماجی و اخلاقی اقداروں کو چیلنج کرتا ہے جہاں عورت کے وجود، خواہش اور احساس کو دبا کر رکھا گیا ہے۔ عصمت نے اس بات کی وضاحت کی کہ عورت محض گھر کی زینت نہیں بلکہ اس کی الگ شناخت ہے۔ عورت کی بھی جذباتی و جسمانی ضروریات ہیں۔ بیگم جان بھی جذباتی و جسمانی محرومی کا شکار ہو کر ایک غیر روایتی راستے کا انتخاب کر کے جنسی تسکین حاصل کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی بیگم جاں کے اس عمل کو اخلاقیات یا گناہ کے کٹہرے میں قید نہیں کرتیں بلکہ وہ جرأت مندانہ اظہار کے ذریعے معاشرے کی منافقانہ اقدار کو بے نقاب کرتی ہیں۔ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اصل بے راہروی فرد کے بجائے اس سماج میں ہے جو عورت کو اختیار اور اظہار سے محروم کر رہا ہے۔ افسانے کی یہی فکر اسے روشن خیالی کی بہترین مثال بنا دیتی ہے۔ یہ کہانی ہم جنس پرستی کی داستان کے بجائے منافق معاشرتی اقدار اور عورت کی نفسیاتی و جسمانی بے بسی کا احتجاج ہے۔ روشن خیالی اسی بات کو واضح کرتی ہے کہ انسان کی ذات، خواہش اور آزادی کو تسلیم کیا جائے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ لحاف میں یہی سوچ ابھرتی ہے کہ عورت بھی زندہ انسان اور خواہش مند وجود ہے۔ بیگم جان کا کردار برصغیر کے معاشرے کی عورت کی اس دبی ہوئی شناخت کو ظاہر کرتا ہے جو سماج نے محصور کر دی ہے۔ مرد کی طرح عورت کی جسمانی خواہشات بھی حقیقی اور فطری ہیں لیکن معاشرہ انہیں نظرانداز کر دیتا ہے۔ لحاف سماجی طور پر ممنوع باتوں کو بے خوفی سے سامنے لاتا ہے یہ جرأت ہی روشن خیالی کی اصل روح ہے۔ عصمت چغتائی نے کھلم کھلا بتایا کہ پردے، اخلاقیات اور تہذیب کے نام پر کس طرح عورت کے جذبات کو دبا دیا جاتا ہے۔ لحاف سماج کی اصلاح کی طرف ایک قدم ہے اور روشن خیالی کی عمدہ مثال کہ عورت کو مکمل انسان تسلیم کیا جائے۔ عصمت خود لحاف کی کہانی کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''جب میں نے لحاف لکھا تو بم پھٹ پڑا۔ ادبی اکھاڑے میں میرے پرزے اڑے۔ کچھ لوگوں نے میری حمایت میں بھی قلم اٹھایا۔ اس دن مجھے فحش نگار کا لقب دے دیا گیا۔ لحاف سے پہلے اور بعد میں جو بھی لکھا گیا اس پر غور نہیں کیا

گیا۔ میں جنسیات پر لکھنے والی فحش نگار ہی جانی گئی۔ یہ تو ابھی چند سال سے نوجوان طبقے نے مجھے بتایا کہ میں فحش نگار نہیں بلکہ حقیقت نگار ہوں۔"[۱۲]

برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام نے اردو افسانے کے فکری، سماجی اور تہذیبی ارتقا پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ایک نئے تاریخی شعور کو جنم دیا جس میں قومی شناخت، انسانی اقدار، مذہبی و تہذیبی رواداری اور فرد کی آزادی جیسے سوالات ابھرے۔ روشن خیالی کے زیرِ اثر افسانہ نگاروں نے فرسودہ سماجی رویوں، تعصبات، جبر، طبقاتی امتیاز اور غیر عقلی تصورات پر سوال اٹھاتے ہوئے انسان کو مرکزِ توجہ بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے سماجی اور نظریاتی بیانیے کے ردِ عمل میں جدیدیت کا رجحان اردو ادب میں ایک نئی فکری اور جمالیاتی صورت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ جدیدیت کے زیرِ اثر اردو افسانہ ایسے تخلیقی مراحل سے گزرا جہاں خارجی، سماجی اور سیاسی مظاہر کے ساتھ ساتھ فرد کی داخلی دنیا، نفسیاتی پیچیدگیوں، وجودی اضطراب اور ذہنی کرب کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اس عہد کے افسانے میں روشن خیالی کا اظہار براہِ راست اصلاحی نعروں یا اجتماعی منشور کے بجائے فرد کے شعور، سوال کرنے کی صلاحیت، خود آگاہی اور داخلی مزاحمت کے ذریعے سامنے آیا۔ جب کہ مابعد جدیدیت نے حقیقت کے واحد اور حتمی تصور کو چیلنج کرتے ہوئے کثیر الجہتی تجربات، مختلف شناختوں، حاشیائی آوازوں اور متنوع ثقافتی رویوں کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں تقسیمِ ہند کے تاریخی تجربے، روشن خیالی کا عقلی و انسانی شعور، جدیدیت کی داخلی احساس اور مابعد جدیدیت کی کثیر المعانی فکر کے درمیان ایک فکری تسلسل نظر آتا ہے۔ عقل پسندی، جبر سے انکار، آزادیِ فکر اور خود شناسی جیسے روشن خیال عناصر خارجی حقیقت نگاری سے آگے بڑھ کر داخلی تجربے، علامت، استعارے اور تہہ دار اسلوب کا حصہ بنتے گئے۔ جدید سائنسی اور تکنیکی ترقی نے اگرچہ انسان کو بے شمار مادی سہولیات فراہم کیں، مگر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی تنہائی، روحانی بے اطمینانی اور وجودی بحران نے جدید انسان کی داخلی کیفیت کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ مرزا حامد بیگ نے بھی جدید انسان کی اسی فکری کشمکش کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اپنے اعتقادات اور روشن خیالی کے درمیان ایسے تضادات کا شکار ہے جس نے اس کی داخلی زندگی کو اضطراب سے دوچار کر دیا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں سیاسی عدم استحکام، فوجی آمریت اور ریاستی جبر کے مختلف ادوار نے اردو افسانے کے فکری اور موضوعاتی دائرے کو مزید وسیع کیا۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لا، ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت اور جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے دوران پیدا ہونے والی سیاسی و سماجی صورتحال نے افسانہ نگاروں کو فرد اور ریاست، آزادی اور جبر، اقتدار اور عوام کے باہمی تعلقات پر غور کرنے کی تحریک دی۔ بالخصوص اظہارِ رائے پر پابندیوں اور سنسر شپ کے ماحول میں افسانہ نگاروں نے براہِ راست احتجاج کے بجائے علامت، استعارے، کنائے اور تمثیل کو تخلیقی وسیلے کے طور پر اپنایا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ پاکستانی اردو افسانے کے لیے ایک گہرے اخلاقی، سیاسی اور فکری بحران کا باعث بنا۔ اس واقعے

کے بعد افسانہ نگاروں کے سامنے ریاست، قوم، شناخت اور اجتماعی ذمہ داری سے متعلق کئی بنیادی سوالات ابھرے۔ اسی طرح جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت اور اسلامائزیشن کی پالیسیوں نے بھی ادبی اور فکری منظر نامے کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ ریاستی سطح پر مذہب کے سیاسی استعمال اور معاشرتی سطح پر بڑھتی ہوئی قدغنوں نے افسانے میں تنقیدی، علامتی اور مزاحمتی رویوں کو مزید تقویت دی۔ ایسے میں افسانہ نگاروں نے انسانی آزادی، فکری خود مختاری، مذہبی رواداری اور سماجی انصاف جیسے موضوعات کو مختلف علامتی اور استعاراتی پیرایوں میں پیش کیا۔ انور سجاد، انتظار حسین، خالدہ حسین، مسعود اشعر، منشایاد، سمیع آہوجا، رشید امجد، زاہدہ حنا، مظہر الاسلام، احمد جاوید، احمد داؤد اور مستنصر حسین تارڑ کے افسانوی ادب میں اس عہد کے فکری اور سماجی اضطراب کی مختلف صورتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

''تماشا'' منشایاد کا علامتی انداز میں لکھا گیا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بظاہر ایک مداری اور جمورے کی کہانی ہے لیکن اس کے پس منظر میں تیسری دنیا کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی زوال کی داستان مخفی ہے۔ منشایاد نے اپنے افسانے ''بوکا'' کی طرح ''تماشا'' میں بھی اقتدار، جبر اور انسان کی بے بسی کو تمثیلی بیانیہ میں پیش کیا ہے۔ افسانے میں باپ اور بیٹے کا کردار مداری اور جمورے کے روپ میں سامنے آتا ہے جو عوام اور حکمران طبقے کے نمائندہ ہیں۔ ان کے ارد گرد موجود بستی وہ معاشرہ ہے جو اخلاقی طور پر مر چکا ہے۔ جہاں لوگ تماشے میں خون بہتا دیکھ کر بھی تالیاں بجاتے ہیں۔ ان تماشائیوں میں سب بچے ہیں لیکن ان کے چہرے پر جھریاں اور ان کے بال سفید ہو چکے ہیں یعنی ان کی عمریں تو بڑھ گئی لیکن ان کے ذہن نابالغ ہی ہیں۔ یہ منظر اس بات کی عکاس ہے کہ تیسری دنیا کے عوام ظلم و جبر کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ان کے احساسات ہی ماؤف ہو چکے ہیں افسانے کے کچھ اقتباسات اس طرح ہیں۔

''اب آخر میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دکھاؤں گا۔''[۱۳]

''وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے، کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔''[۱۴]

''تماشا'' دراصل روشن خیالی کے تصورات کی نمائندگی کرتے ہوئے انسان کی اجتماعی غفلت، سیاسی جبر اور اخلاقی پستی کا احساس دلاتا ہے کہ اگر ہم شعوری طور پر بیدار نہ ہوئے تو ہم اس معاشرے کا حصہ بن جائیں گے جہاں تالیاں بجتی رہتی ہیں مگر کوئی زندہ نہیں رہتا۔ تماشا میں روشن خیالی کے رجحان کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی شعوری بیداری، اخلاقی احساس اور سماجی ذمہ داری کیا ہے۔ بستی کے بچے ایسے معاشرے کی علامت ہیں جو علم و شعور سے محروم رہتے ہوئے جمود و بے حسی کا شکار ہو چکا ہے۔ افسانے میں مداری اور جمورہ انسان کے دو پہلو ہیں ایک طاقت کا اور دوسرا محکومی کا۔ افسانہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان جب عقل و فکر کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ اخلاقی طور پر مر جاتا ہے اور وہ ظلم و جبر کو بھی معمولی سمجھ کر قبول کرتا رہتا ہے۔ تاہم روشن خیالی اسی وقت ممکن ہے جب فرد اور معاشرہ تماشائی بننے کے بجائے سچائی، انصاف اور انسانیت کے لیے مل کر اقدامات کریں۔ عطاالحق قاسمی کے بقول:

''ہمارے ملک میں پچھلے پچاس سالوں سے جو نظام نافذ ہے اس کے ردِ عمل میں آج ہمارا معاشرہ بچوں کے اس غول

جیسا ہے جو منشا کے افسانے ''تماشا'' میں مداری کے گرد جمع ہوتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ پر اس سے زیادہ دردناک اور دل ہلا دینے والا تبصرہ افسانے کی صورت میں شاید کسی نے بھی نہیں لکھا۔''[۱۵]

پرویز مشرف کے دور میں پیش کیا جانے والا تصورِ ''روشن خیالی'' پاکستانی سماج کے سیاسی، سماجی اور فکری منظر نامے میں ایک اہم اور متنازع موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''روشن خیال اعتدال'' کے تصور نے اگرچہ مختلف سطحوں پر بحث اور اختلاف کو جنم دیا، تاہم اس نے معاشرے کو اعتدال، مذہبی رواداری، جدید تعلیم اور شدت پسندی کے خلاف ایک نئے فکری بیانیے کی طرف متوجہ کیا۔ اسی عرصے میں عالمی سیاست کے بدلتے ہوئے حالات، خصوصاً نائن الیون کے واقعے، افغانستان میں جنگ، عراق پر امریکی حملے اور عالمی سطح پر دہشت گردی کے خلاف جنگ نے پاکستانی معاشرے کو شدید متاثر کیا۔ اس بدلتے ہوئے ماحول میں اردو افسانہ بھی نئے موضوعات سے دوچار ہوا اور دہشت گردی، انتہا پسندی، مذہبی شدت پسندی، جنگ، خوف، ہجرت، شناخت کے بحران اور انسانی اقدار کے زوال جیسے مسائل اس کے اہم موضوعات بنتے گئے۔ یوں روشن خیالی کا تصور محض ایک سیاسی نعرہ کے بجائے افسانے میں تنقیدی شعور، انسانی آزادی، رواداری اور شدت پسندی کے خلاف فکری مزاحمت کی صورت اختیار کرنے لگا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

''یہ ایک نئی طرز کا مزاحمتی رجحان ہے جسے ہم اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں منتقل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔''[۱۶]

اردو افسانے کے اس پورے فکری سفر میں روشن خیالی کے کئی رجحانات سامنے آتے ہیں۔ جنھوں نے افسانے کے اظہار کو نئی جہتیں بخشیں۔ ایسے میں اردو افسانہ اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کی عکاسی کرنے والی صنف ادب سے نکل کر ان حالات کے پس پشت موجود فکری اور تہذیبی ساختوں کو پرکھنے اور ان پر سوال قائم کرنے کا وسیلہ بھی بن گیا۔ روشن خیالی کے رجحانات کی بدولت اردو افسانہ اپنے قارئین کو صرف معاشرتی حقیقتوں کا مشاہدہ نہیں کرواتا بلکہ ان حقیقتوں کی معنویت، جواز اور نتائج پر غور کرنے کی تحریک بھی دیتا ہے۔ ایسے میں سوال، تنقیدی شعور، عقل پسندی، خود آگاہی، ظلم و جبر سے انکار اور انسانی آزادی کے جستجو جیسے رجحانات اردو افسانے کی تشکیل کرتے ہوئے عہد حاضر کے افسانوی ادب کو وسیع فکری تناظر فراہم کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. علی عباس جلال پوری، ڈاکٹر، ''خرد نامہ جلال پوری''، تخلیقات، لاہور، ۲۰۲۳، ص۵
۲. جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''قومی انگریزی اردو لغت''، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص۶۶۹
۳. سید احمد دہلوی، ''فرہنگ آصفیہ''، جلد دوم، مرتبہ: مکتبہ حسن سہیل، لاہور، ص۱۸۶
۴. وقار عظیم، پروفیسر، ''داستان سے افسانے تک''، دہلی، جون ۱۹۷۲ء، ص۲۱
۵. راشد الخیری، ''طلاقن کا سفید بال''، مشمولہ ''سیلاب اشک''، عصمت بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۴ء، ص۴۹،۵۰

۶. راشد الخیری، ''نند کا شکار''، مشمولہ ''گرداب حیات''، عصمت بک ایجنسی، دہلی، اگست ۱۹۴۷، ص ۷۵

۷. پریم چند، ''سوا سیر گیہوں''، مشمولہ ''مجموعہ منشی پریم چند افسانے''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۸۲۴

۸. محمد مبین، پروفیسر، ''اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب''، کاک آفسیٹ پرنٹر، دہلی، ۲۰۰۸، ص ۱۱۱

۹. سجاد ظہیر، ''جنت کی بشارت''، مشمولہ ''انگارے''، خالد علوی مولف، عفیف پرنٹر، دہلی، ۲۰۱۳، ص ۱۱۷

۱۰. محمد حسن، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ: ادبی و تنقیدی جائزہ''، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۵۴، ص ۱۱۹

۱۱. عصمت چغتائی، ''لحاف''، مشمولہ ''چوٹیں'' راہی کتاب گھر، ۲۰۰۸، ص ۹۹

۱۲. عصمت چغتائی، ''کاغذی ہے پیرہن'' خود نوشت، روہتاس بکس، احمد چیمبر، لاہور، اشاعت اول: ۱۹۹۴، ص ۹۹

۱۳. نجیبہ عارف، ''نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ'' پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول: مئی ۲۰۱۱، ص ۲۵

۱۴. منشا یاد، ''بوکا'' مشمولہ ''خلا اندر خلا'' برق سنز، اسلام آباد، طبع اول مارچ ۱۹۸۳ء ص ۳۲

۱۵. ایضا ص ۳۳

۱۶. عطاالحق قاسمی، ''اردو افسانے کے شہر کا دروازہ'' (دہلی) سہ ماہی ادب ساز جلد نمبر ا, شمارہ اکتوبر ۲۰۰۶ء ص ۱۶۱

References

1. Jalalpuri, A. A. (2023). *Khird nama Jalalpuri*. Takhleeqat.
2. Jalibi, J. (1992). *Qaumi Angrezi–Urdu Lughat*. Muqtadra Qaumi Zaban Pakistan.
3. Dehlvi, S. A. (n.d.). *Farhang-e-Asfiya* (Vol. 2). Maktaba Hasan Suhail.
4. Azeem, W. (1972). *Dastan se afsane tak*. Delhi.
5. Khairi, R. (1944). Talaqan ka safed baal. In *Sailab-e-Ashk* (pp. 49–50). Ismat Book Depot.
6. Khairi, R. (1947, August). Nand ka shikar. In *Girdab-e-Hayat* (p. 75). Ismat Book Agency.
7. Premchand. (2003). Sawa seer gehun. In *Majmua Munshi Premchand Afsanay* (p. 824). Sang-e-Meel Publications.
8. Mubeen, M. (2008). *Urdu mein beeswin sadi ka afsanvi adab*. Kak Offset Printer.
9. Zaheer, S. (2013). Jannat ki basharat. In K. Alvi (Ed.), *Angare* (p. 117). Afeef Printer.
10. Hasan, M. (1954). *Urdu afsana: Adabi wa tanqeedi jaiza*. Idara Farogh-e-Urdu.
11. Chughtai, I. (2008). Lihaaf. In *Chotain* (p. 99). Rahi Kitab Ghar.
12. Chughtai, I. (1994). *Kaghazi hai pairahan* (Autobiography). Rohatas Books.

13. Arif, N. (2011). *Nine Eleven aur Pakistani Urdu afsana* (1st ed.). Poorab Academy.
14. Yad, M. (1983). Boka. In *Khala andar khala* (p. 32). Barq Sons.
15. Yad, M. (1983). *Khala andar khala* (p. 33). Barq Sons.
16. Qasmi, A. H. (2006, October). Urdu afsane ke shehr ka darwaza. *Seh Maahi Adab Saaz*, 1, 161.